Al-Mīthāq *(Research Journal of Islamic Theology)*
ISSN: 2791-0989 (P), 2791-0997 (E)
Volume 05, **Issue** 01, January - March 2026, **PP**: 151-168
Open Access at: https://almithaqjournal.org/

Article QR

والدین کے فیصلوں کی تقدیس اور اولاد کا نفسیاتی اضطراب: ایک سماجی مغالطے کا علمی تجزیہ

The Sanctification of Parental Decisions and the Psychological Distress of Children: An Academic Analysis of a Social Fallacy

1. Almas Ilyas meshiiayman@gmail.com	*MPhil Scholar,* *Department of Islamic Studies,* *Riphah International University Islamabad,* *Faisalabad Campus.*
2. Dr. Khalid Mahmood Arif *(Corresponding Author)* khalid.mahmood@riphahfsd.edu.pk	*HOD,* *Department of Islamic Studies,* *Riphah International University Islamabad,* *Faisalabad Campus.*

How to Cite:	Almas Ilyas and Dr. Khalid Mahmood Arif. 2026: "The Sanctification of Parental Decisions and the Psychological Distress of Children: An Academic Analysis of a Social Fallacy". Al-*Mīthāq (Research Journal of Islamic Theology)* 5 (01): 151-168.
Article History:	**Received**: 02-03-2026	**Accepted**: 25-03-2026	**Published**: 31-03-2026
Copyright:	**©The Authors**
Licensing:	This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.
Conflict of Interest:	Author(s) declared no conflict of interest.

Abstract & Indexing

Publisher

HIRA INSTITUTE
of Social Sciences Research & Development

والدین کے فیصلوں کی تقدیس اور اولاد کا نفسیاتی اضطراب: ایک سماجی مغالطے کا علمی تجزیہ

The Sanctification of Parental Decisions and the Psychological Distress of Children: An Academic Analysis of a Social Fallacy

1. **Almas Ilyas**
MPhil Scholar, Department of Islamic Studies,
Riphah International University Islamabad, Faisalabad Campus.
meshiiayman@gmail.com

2. **Dr. Khalid Mahmood Arif,** *(Corresponding Author)*
HOD, Department of Islamic Studies,
Riphah International University Islamabad, Faisalabad Campus.
khalid.mahmood@riphahfsd.edu.pk

Abstract

This study critically examines the socio-religious construct of the "sanctity of parental decisions" and its correlation with psychological anxiety among offspring in contemporary Pakistan. Methodologically, the research employs a qualitative approach, utilizing thematic analysis of classical fatwa literature and Qur'ānic exegesis (tafsīr) alongside contemporary psychological literature. The study analyzes how traditional interpretations often conflate the Qur'ānic mandate of Iḥsān (benevolence) with absolute parental infallibility. By drawing on primary sources from Uṣūl al-Fiqh and classical juristic discourse and secondary data from behavioral psychology, the research identifies a significant "epistemological gap" in current family discourse. The findings demonstrate that the lack of bilateral communication and the suppression of individual agency are not merely social issues but are rooted in a "social fallacy" that misrepresents divine ethics. The conclusion asserts that resolving the Youth Identity Crisis requires a transition from "blind sanctity" to a Normative Ethical Framework of mutual respect (*Muwadda*). It specifically recommends that Islamic family counseling models must integrate the concept of "Individual Agency" (Ahl-ul-Ikhtiyār) to mitigate Intergenerational Conflict. This recalibration is essential for fostering a psychologically resilient generation and a balanced family structure in accordance with the higher objectives (Maqāṣid) of Sharī'ah.

Keywords: *Family Ethics in Islam, Youth Identity Crisis, Intergenerational Conflict, Parental Infallibility, Social Fallacy, Psychological Anxiety, Individual Agency.*

تعارفِ موضوع

انسانی تمدن کی تاریخ میں خاندانی اکائی ہمیشہ سے ایک کلیدی ستون رہی ہے۔ یہاں والدین اور اولاد کا رشتہ محض حیاتیاتی تعلق نہیں، بلکہ اخلاقیات اور نفسیاتی استحکام کا سنگِ میل ہے۔ اسلامی فکر میں والدین کے مرتبے کو نہایت بلند درجے پر فائز کیا گیا ہے۔ اس تناظر میں "احسان" اور "اطاعت" کو ایمان کے تقاضوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ تاہم، عصرِ حاضر کے پاکستانی معاشرے میں ایک ایسا سنگین سماجی مغالطہ پروان چڑھ چکا ہے جس نے والدین کے احترام کو "مطلق تقدیس" کا روپ دے دیا ہے۔ یہ تصور اکثر انسانی بشریت کی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ یہ مقالہ اس اہم علمی نکتے سے بحث کا آغاز کرتا ہے کہ احترام اور تقدیس دو الگ منطقے

ہیں۔ احترام ایک دوطرفہ اخلاقی رویہ ہے جو محبت اور وقار پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، تقدیس کا موجودہ سماجی بیانیہ والدین کو کسی بھی خطا سے بالاتر (Infallible) قرار دیتا ہے۔ اس بیانیے میں ان کے ہر فیصلے کو الہامی حکم کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ جب والدین کے انسانی فیصلوں کو یہ "مقدس اتھارٹی" حاصل ہوتی ہے، تو اولاد کی انفرادی شناخت متاثر ہوتی ہے۔ یہی عمل آگے چل کر "نفسیاتی اضطراب" (Psychological Anxiety) کی بنیاد بنتا ہے۔

موجودہ فکری صورتحال میں یہ تحقیق ایک بنیادی سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کیا اسلامی اخلاقیات اور کلاسیکی فقہی بیانیہ والدین کے فیصلوں کو فی الواقع "مطلق تقدیس" فراہم کرتا ہے؟ یا یہ محض ایک سماجی تعبیر ہے جس نے وقت کے ساتھ غیر لچکدار مذہبی رنگ اختیار کر لیا ہے؟ یہ مطالعہ اس اثر کا بھی جائزہ لیتا ہے کہ فیصلوں کی یہ غیر متبدل حیثیت اولاد کی نفسیاتی نشوونما کو کس حد تک متاثر کر رہی ہے۔ اس تحقیق کا بنیادی مقصد اصولِ فقہ اور کلاسیکی مباحث کی روشنی میں احترام اور مطلق تقدیس کے علمی فرق کو واضح کرنا ہے۔ اس سے والدین کے فیصلوں کی "خطاپذیری" (Fallibility) کے تصور کی علمی بازیافت ممکن ہو سکے گی، جو رشتوں میں توازن کی راہ ہموار کرے گی۔

تحقیق کی یہ جہت اس لیے ناگزیر ہے کیونکہ روایتی سماجی بیانیے میں اطاعت کو انفرادی اختیار (Individual Agency) کے خاتمے کے مترادف سمجھ لیا گیا ہے۔ اس فکری تعطل کے نتیجے میں نوجوان نسل ایک گہرے وجودی کرب کا شکار ہے، جہاں وہ اپنی فطری صلاحیتوں اور غیر لچکدار توقعات کے درمیان ایک مسلسل کشمکش میں مصروف ہے۔ یہ مقالہ والدین کی توقیر کو کم کرنے کی بجائے "مقاصدِ شریعہ" اور "مودت" کے ان گم گشتہ اصولوں کی بازیافت ہے جو ایک توانا معاشرے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ خوف پر مبنی رشتہ کبھی بھی اس خاندانی سکون کا ضامن نہیں بن سکتا جس کا تذکرہ قرآن میں ملتا ہے۔ لہٰذا، یہ مطالعہ مذکورہ مآخذ کی روشنی میں اس خلیج کو پاٹنے کی ایک علمی سعی ہے، تاکہ رشتوں میں تقدس کے نام پر پیدا ہونے والے نفسیاتی تناؤ کو ختم کر کے ایک صحت مند مکالمے کی بنیاد رکھی جا سکے۔

سابقہ کام کا جائزہ

اس موضوع پر موجود علمی ذخیرے کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ والدین اور اولاد کے تعلق کو دو مختلف انتہاؤں پر دیکھا گیا ہے۔ کلاسیکی اسلامی لٹریچر، بالخصوص امام غزالی (احیاء علوم الدین) اور امام نووی (شرح صحیح مسلم) کے ہاں والدین کے حقوق اور اطاعت کے حدود و قیود پر تفصیلی ابحاث ملتی ہیں۔ اسی طرح امام ابنِ تیمیہ (مجموع الفتاویٰ) اور ان کے تلمیذِ رشید امام ابنِ قیم (تحفۃ المودود باحکام المولود) نے والدین کے ساتھ "احسان" کے برتاؤ کو انسانی اخلاقیات کا لازمی جزو قرار دیا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے (حجۃ اللہ البالغہ) میں خاندانی نظام کی سماجی و روحانی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ تاہم، ان روایتی ابحاث میں بنیادی توجہ اخلاقی و قانونی ذمہ داریوں پر رہی ہے۔ ان میں اولاد کی "نفسیاتی خودمختاری" (Psychological Autonomy) کو ایک مستقل تحقیقی عنوان کے طور پر نسبتاً کم موضوع بنایا گیا ہے۔ عصرِ حاضر میں محمد ابوزہرہ (تنظیم الاسرۃ) جیسے فقہاء نے بھی خاندانی قوانین پر کام کیا ہے، لیکن والدین کے فیصلوں سے پیدا ہونے والے "نفسیاتی اضطراب" پر ابھی علمی خلا موجود ہے۔

دوسری جانب، جدید نفسیات کے میدان میں ایرک ایرکسن (Childhood and Society) کے نظریات اور ڈائنا بومرنڈ (Diana Baumrind) کے "Parenting Styles" کے نظریے پر وسیع تحقیقی کام ہوا ہے۔ یہ تحقیقات واضح کرتی ہیں کہ حد سے زیادہ کنٹرول کرنے والا (Authoritarian) رویہ اولاد میں دائمی بے چینی کا باعث بنتا ہے۔ اسی طرح کارل راجرز (On

(Becoming a Person) نے "غیر مشروط مثبت توجہ" کی اہمیت پر زور دیا ہے، جو خاندانی توازن کے لیے ناگزیر ہے۔ مغربی لٹریچر میں "انفرادی اختیار" (Individual Agency) اور ذہنی صحت کے تعلق پر بہت کام ہوا ہے۔ تاہم، ان تحقیقات کا رخ اکثر مغربی معاشروں کی جانب رہا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں والدین کے فیصلوں کو "مقدس" سمجھنے کا مخصوص مذہبی و ثقافتی تناظر موجود ہے۔ ان نفسیاتی نظریات کے یہاں اطلاق پر تاحال کام کی شدید کمی محسوس کی جاتی ہے۔

پاکستان میں خاندانی نظام پر ہونے والی حالیہ سماجی تحقیقات میں والدین کے دباؤ کا تذکرہ تو ملتا ہے، لیکن ان کا رخ زیادہ تر سماجی شماریات (Social Statistics) کی طرف رہا ہے۔ جدید اسلامی فکر میں طارق رمضان (Radical Reform) جیسے مفکرین نے مسلم شناخت اور انفرادی آزادی پر بحث کی ہے۔ اس کے باوجود، اس پہلو سے "علمی بازیافت" ابھی باقی ہے کہ کس طرح "تقدیس" کی ایک مخصوص سماجی تعبیر کو اسلامی اصولوں کا رنگ دے کر نفسیاتی مسائل کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یہ تحقیق اس علمی خلا کو پر کرنے کی ایک سعی ہے۔ یہاں کلاسیکی فقہی مباحث اور جدید نفسیاتی بصیرتوں کو یکجا کر کے اس سماجی مغالطے کا حل تلاش کیا جائے گا جو تقدیس اور احترام کے فرق کو دھندلا دیتا ہے۔

معاشرتی اخلاقیات اور توازنِ حقوق

انسانی معاشرت کا حسن باہمی رشتوں کے توازن میں پوشیدہ ہے، جہاں فرد کی آزادی اور سماجی ذمہ داریوں کے درمیان ایک باریک حدِ فاصل موجود ہوتی ہے۔ اسلامی فکر میں خاندانی نظام کو ایک ایسی اکائی کے طور پر دیکھا گیا ہے جہاں ہر فرد کا مقام متعین ہے۔ تاہم، برصغیر کے مخصوص ثقافتی پس منظر میں والدین کے احترام کے تصور کو اس قدر وسعت دے دی گئی ہے کہ وہ اکثر "مطلق تقدیس" کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ تقدیس جہاں خاندانی استحکام کا باعث بنتی ہے، وہیں بعض اوقات اولاد کی نفسیاتی خود مختاری اور انفرادی شناخت کے لیے ایک چیلنج بھی بن جاتی ہے۔ اس فکری گتھی کو سلجھانے کے لیے کلاسیکی اسلامی مآخذ کا مطالعہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

غزالی کا تصورِ حقوقِ رفاقت

امام ابو حامد الغزالیؒ نے "احیاء علوم الدین" میں انسانی تعلقات کو محض قانونی بندھن کی بجائے اخلاقی اور روحانی بنیادوں پر پرکھا ہے۔ رشتوں کے حقوق کی بحث میں وہ کسی ایک فریق کو دوسرے پر اس حد تک غالب نہیں کرتے کہ دوسرے کی انسانی حیثیت اور اخلاقی قدر مجروح ہو جائے۔ امام ابو حامد الغزالی رقم طراز ہیں:

> "اولاد کے حقوق کے سلسلے میں بھی روایات وارد ہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے سرکارِ دوعالم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! میں کس کے ساتھ حسنِ سلوک کروں؟ فرمایا: والدین کے ساتھ! عرض کیا میرے والدین نہیں ہیں، فرمایا: تب بچوں کے ساتھ (یاد رکھو) جس طرح تمہارے والدین کے تم پر کچھ حقوق ہیں، اسی طرح تمہاری اولاد کے بھی تم پر کچھ حقوق ہیں۔ سرکارِ دوعالم ﷺ نے اس شخص کے لیے دعائے رحمت فرمائی ہے جس نے نیک بننے پر اولاد کو اپنی مدد اور اعانت سے نوازا، یعنی اس نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جسے دیکھ کر اس کی اولاد نافرمان ہو جائے۔"[1]

اسی طرح ایک روایت ہے کہ:

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: إِنَّمَا سَمَّاهُمُ اللَّهُ أَبْرَارًا، لأَنَّهُمْ بَرُّوا الْآبَاءَ وَالأَبْنَاءَ، كَمَا أَنَّ لِوَالِدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، كَذَلِكَ لِوَلَدِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ"[2]

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان کا نام (قرآن میں) ابرار رکھا ہے، کیونکہ انہوں نے اپنے آباء واجداد اور بچوں سے حسنِ سلوک کیا ہے۔ جس طرح تیرے والدین کا تجھ پر حق ہے، اسی طرح تیری اولاد کا بھی تجھ پر حق ہے۔

روایت کے الفاظ "جس طرح تمہارے والدین کے تم پر کچھ حقوق ہیں، اسی طرح تمہاری اولاد کے بھی تم پر کچھ حقوق ہیں" اس معاشرتی رویے کی فکری اصلاح کرتے ہیں جو والدین کو "مطلق العنان" (Absolute Authority) سمجھ کر پیش کرتا ہے۔ جب اللہ کے رسول ﷺ نے والدین کے حقوق کے ساتھ ہی اولاد کے حقوق کا ذکر فرمایا، تو اس سے یہ علمی اصول وضع ہوتا ہے کہ خاندانی نظام محض یکطرفہ فرائض کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک دوطرفہ اخلاقی میثاق ہے۔ علمی اعتبار سے یہ "برابری" اس سماجی تقدیس کے مبالغہ آمیز تصور کی اصلاح کرتی ہے جو عموماً صرف والدین کے حقوق پر اصرار کرتا ہے۔ جب حقوق کا ترازو دونوں طرف متوازن ہے، تو والدین کی طرف سے اولاد کے جذبات اور ان کی انفرادی رائے کو نظر انداز کرنا دراصل اس نبوی ﷺ حکمت سے انحراف ہے جس کی طرف امام غزالیؒ اشارہ کر رہے ہیں۔

والدین بحیثیت معاونِ نیکی (Facilitators of Obedience)

مذکورہ بالا روایت کا دوسرا رخ اس پہلو کو اجاگر کرتا ہے جہاں اس شخص کے لیے "دعائے رحمت" کی گئی ہے جو اولاد کو فرمانبرداری پر "مدد اور اعانت" فراہم کرے۔ یہاں "اعانت" سے مراد والدین کا وہ طرزِ عمل ہے جو اولاد کے لیے خوش دلی سے اطاعت کرنا ممکن بنائے۔ جب والدین ذاتی ترجیحات یا سماجی دباؤ کے تحت اولاد کے فطری حقوق اور رائے کو اہمیت نہیں دیتے، تو وہ دراصل اولاد کے لیے فرمانبرداری کی راہ میں نفسیاتی رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہوتے ہیں۔ علمی اعتبار سے، والدین کی یہ "عدمِ اعانت" اولاد میں وہ نفسیاتی اضطراب پیدا کرتی ہے جو بالآخر خاموش مزاحمت یا واضح اختلاف کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

طرزِ عمل کی اصلاح اور والدین کا کردار

امام غزالیؒ کی یہ وضاحت کہ "والدین ایسا کوئی کام نہ کریں جسے دیکھ کر اولاد نافرمان ہو جائے"، اس سماجی رویے کی اصلاح کرتی ہے جہاں والدین اپنی ترجیحات کو "مقدس" بنا کر اولاد پر مسلط کر دیتے ہیں۔ اگر والدین کی حد سے بڑھی ہوئی سختی یا غیر لچکدار رویہ اولاد کی نفسیاتی اور شخصی آزادی کو مجروح کرے، تو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی دوری کا ایک بڑا سبب وہ طرزِ عمل ہے جس نے اولاد کو اس نہج پر لا کھڑا کیا۔ یہ نکتہ ثابت کرتا ہے کہ والدین کا احترام ایک مسلمہ حقیقت ہے، مگر ان کے فیصلوں کو "مطلق" درجہ دے کر اولاد کی انفرادی شناخت کو نظر انداز کرنا اسلامی اخلاقیات کے توازن کے منافی ہے۔ لہٰذا اولاد کی ذہنی صحت اور نفسیاتی راحت کا تحفظ کرنا والدین کی وہ بنیادی ذمہ داری ہے جس پر ان کی اپنی "دعائے رحمت" کا انحصار ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ والدین کا بلند درجہ ان کی جوابدہی کو کم نہیں کرتا۔ اگر وہ اولاد کے شرعی حقوق اور انسانی تکریم کا لحاظ نہیں رکھیں گے، تو وہ اس نبوی توازن کو متاثر کرنے کے ذمہ دار ہوں گے جو رشتوں میں عدل اور سماجی استحکام کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

تعلیماتِ نبوی ﷺ کے قائم کردہ توازن سے انحراف

ہماری معاشرت میں جب والدین اپنی اولاد کی زندگی کے بنیادی فیصلے ان کے فطری جذبات اور شرعی حقوق کو نظر انداز کر کے کرتے ہیں، تو یہ طرزِ عمل نبوی ﷺ تعلیمات کے قائم کردہ توازن سے انحراف کا باعث بنتا ہے۔ والدین کی اطاعت کا جذبہ ایک

عظیم اخلاقی قدر ہے، لیکن جب یہ قدر اولاد کے انفرادی حقوق کے غصب کا ذریعہ بن جائے، تو یہ اس عدل کے خلاف ہے جس کا حکم اس حدیث میں دیا گیا ہے۔

غیر متوازن توقعات اور جذباتی دباؤ

سماجی سطح پر والدین کے احترام سے متعلق مخصوص نصوص کو تو کثرت سے بیان کیا جاتا ہے، لیکن اولاد کے حقوق پر مبنی نصوص پر خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے۔ جب والدین اپنی ترجیحات کو "مقدس" بنا کر اولاد پر مسلط کرتے ہیں، تو یہ تقدیس کے نام پر پیدا ہونے والی غیر متوازن توقعات کا شاخسانہ ہے۔ علمی تناظر میں، کسی کی پوری زندگی کو مشاورت کے بغیر اپنی خواہش کی بھینٹ چڑھا دینا اس امانت کی روح کے منافی ہے جو اولاد کی صورت میں والدین کو تفویض کی گئی ہے۔

حقوق کی ہمسری (Equivalence of Rights)

حدیث کے الفاظ میں "جس طرح" اور "اسی طرح" کی مماثلت یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ حقوق اخلاقی اہمیت میں برابر ہیں۔ اگر اولاد کی طرف سے والدین کے حقوق میں کوتاہی ایک شرعی عذر ہے، تو والدین کی طرف سے اولاد کے جذبات کی پامالی اور ان پر بے جا دباؤ بھی ایک علمی و اخلاقی سوالیہ نشان ہے۔ یہ سماجی تصور جو والدین کو ہر قسم کے سہو و خطا سے بالاتر سمجھتا ہے، دراصل اس نبوی ﷺ حکمت کے برعکس ہے جو ہر ذی حق کو اس کا حق دینے کی تلقین کرتی ہے۔ لہٰذا والدین کا احترام ہرگز اس بات کا لائسنس نہیں ہے کہ وہ اولاد کے شرعی اور فطری اختیارات کو سلب کر لیں۔ جو والدین اولاد پر اپنی مرضی مسلط کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں، وہ دراصل اس وسیع تر ذمہ داری کو نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں جو اللہ کے رسول ﷺ نے ان پر عائد کی ہے۔ رشتوں کا استحکام تبھی ممکن ہے جب تقدیس کے لبادے میں چھپے سماجی دباؤ کی بجائے اس توازن کو اپنایا جائے جو کلاسیکی اسلامی روایت کا خاصہ ہے۔ امام ابو حامد محمد غزالی مزید رقم طراز ہیں:

> "اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ والدین کی اطاعت مشتبہات میں واجب ہے یہاں تک کہ اگر ان کے دستر خوان پر کوئی مشتبہ کھانا موجود ہو اور وہ تمہیں کھانے میں شریک کرنا چاہیں نیز یہ اندیشہ ہو کہ اگر تم نے انکار کر دیا تو وہ ناراض ہوں گے ایسی حالت میں ان کے ساتھ کھانا چاہیے کیوں کہ شبہ سے بچنا ورع ہے اور والدین کے حکم کی بجا آوری واجب ہے۔ "ورع" کو واجب پر ترجیح نہیں دی جا سکتی، مباحات اور نوافل کے لیے ان کی اجازت کے بغیر سفر کرنا جائز نہیں ہے۔"[3]

امام غزالیؒ کی اس عبارت میں اطاعتِ والدین کے جس دائرہ کار کا تعین کیا گیا ہے، وہ فقہی اصولوں کے تحت خاندانی نظام کی وحدت اور انفرادی حقوق کے مابین توازن برقرار رکھنے کی ایک علمی کوشش ہے۔ اس فقہی استدلال کو اگر اساسی نبوی اصول "لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق"[4] سے جوڑ کر دیکھا جائے تو درج ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں:

اطاعت کا دائرہ اور شخصی معاملات

اگرچہ امام صاحبؒ کی اس بحث کا براہِ راست تعلق خوراک اور سفر کے مشتبہات سے ہے، تاہم اس اصول سے یہ علمی اشارہ ملتا ہے کہ اطاعت کا دائرہ ہر معاملے میں یکساں نہیں رہتا۔ تعلیم، پیشہ ورانہ انتخاب اور دیگر بڑے زندگی کے فیصلے محض "مباح" نہیں بلکہ فرد کی استعداد اور مستقبل سے جڑے بنیادی معاملات ہیں۔ لہٰذا، اطاعت کا اطلاق ان تمام امور پر لازمی طور پر مسلط نہیں کیا جا

سکتا جو فرد کی زندگی کے ڈھانچے پر اثر انداز ہوں، بلکہ یہاں اطاعت "معروف" کے دائرے تک محدود ہو جاتی ہے۔

انفرادی ارادہ اور انسانی وقار

علمی مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اطاعت کا شرعی تصور انفرادی ارادے کو مکمل طور پر محدود کرنے کے لیے نہیں ہے۔ جہاں والدین کا احترام اور خاندانی ہم آہنگی ضروری ہے، وہیں اولاد کی شخصی آزادی کی نفی کرنا اطاعت کے اصل مقصد کے خلاف ہے۔ رشتوں میں تقدیس کا احترام بلاشبہ لازم ہے، مگر یہ تقدیس فرد کے انسانی وقار اور اس کی جائز آزادیوں کو سلب کرنے کا جواز نہیں بننی چاہیے۔

امام غزالیؒ کی فکر اور فقہی استدلال اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ اسلامی معاشرت میں اطاعتِ والدین ایک تعمیری اصول ہے، جس کا بنیادی مقصد خاندانی استحکام اور معاشرتی توازن کا قیام ہے۔ علمی مطالعہ اس اہم نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ رشتوں میں عدل کی صورت تبھی ممکن ہے جب والدین کی شفقت اور اولاد کی شخصی خود مختاری کے مابین ایک واضح، منصفانہ اور شرعی حد بندی موجود ہو۔ یہ اساسی اصول اس تصور کی بیخ کنی کرتا ہے کہ اطاعت کا مقصد اولاد کی زندگی کو نفسیاتی جبر یا کسی اجیرن صورتحال سے دوچار کرنا ہے، بلکہ اس کا حقیقی منشا انسانی تعلقات میں سہولت اور آسانی پیدا کرنا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ موافقت اور انسانی ارادے کی اہمیت

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی معرکہ آرا تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں انسانی تمدن اور خاندانی نظم پر بحث کرتے ہوئے فرد کی پسند اور اس کی فطری رغبت کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "میں کہتا ہوں مخطوبہ کو دیکھ لینا اس لیے مستحب ہے کہ نکاح دیکھنے کے بعد کیا جائے اور اس ندامت سے بچ جائے جو بلا دیکھے بھالے نکاح کر لینے اور طبیعت کے موافق نہ ہونے اور اس کے رد نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے، اور اگر دیکھنے کے بعد رد کرے تو اس کی تلافی آسان ہوتی ہے اور دیکھنے کے بعد اگر نکاح اس کی طبیعت کے موافق ہو تو اس عورت کے ساتھ شادی کرنا شوق اور نشاط کے ساتھ ہو، اور عقلمند آدمی جب تک کسی چیز کی بھلائی اور برائی کو پہلے سے نہیں دیکھ لیتا اس کا اقدام نہیں کرتا"[5]

نکاح میں موافقتِ طبع اور تمدنی استحکام

شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک نکاح محض دو افراد کا قانونی ملاپ نہیں بلکہ دو طبیعتوں کی موافقت کا نام ہے۔ شاہ صاحب لفظ "ندامت" کے ذریعے یہ واضح کر رہے ہیں کہ اگر نکاح میں فریقین کی ذہنی اور قلبی آمادگی شامل نہ ہو، تو ایسا رشتہ پائیدار نہیں ہو سکتا۔ زبردستی یا بغیر دیکھے بھالے کیے گئے فیصلے بعد میں پچھتاوے کا سبب بنتے ہیں، جس کا انجام اکثر رشتے کے "رد" ہونے یا مستقل تناؤ کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ نکاح جیسے نازک فیصلے میں فرد کی پسند کو نظر انداز کرنا دراصل تمدنی فساد کی بنیاد رکھنا ہے۔

نشاطِ قلب اور رضامندی کا شرعی فلسفہ

شاہ صاحب نے شادی کے لیے "خوشی اور نشاط" کی اصطلاح استعمال کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام میں رضامندی کا مطلب محض "خاموشی یا مجبوری کا ہاں" نہیں، بلکہ دلی اطمینان ہے۔ جب شاہ صاحب کہتے ہیں کہ دیکھنے کے بعد نکاح "نشاط" کے ساتھ ہوتا ہے، تو وہ دراصل فرد کے اس حق کو تسلیم کر رہے ہیں کہ وہ اپنے جیون ساتھی کا انتخاب اپنی فطری رغبت کی بنیاد پر کرے۔

جہاں یہ رغبت مفقود ہو، وہاں تقدیسِ رشتہ کے نام پر جبر کرنا شاہ صاحب کے پیش کردہ عمرانی اصولوں کے منافی ہے۔

انتخابِ رشتہ میں دین و اخلاق کا معیار اور والدین کی حدود

شاہ صاحب نے حجۃ البالغہ میں اس نبوی ﷺ اصول کو بھی نقل کیا ہے کہ اگر کوئی بااخلاق اور دیندار شخص پیغام بھیجے تو اسے محض دنیاوی وجوہات پر رد کرنا زمین میں "فتنہ اور بڑا فساد" پیدا کرنے کے مترادف ہے۔[6] یہاں سے یہ علمی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ والدین کا کام اولاد کی رہنمائی کرنا اور معیارات (دین و اخلاق) طے کرنا ہے، نہ کہ ان پر اپنی ذاتی پسند یا برادری کے فیصلے مسلط کرنا۔ اگر اولاد ایک شرعی اور اخلاقی دائرے میں رہ کر انتخاب کر رہی ہے، تو والدین کا اس میں رکاوٹ بننا تمدنی بگاڑ کا راستہ کھولتا ہے۔

اساسی انسانی حقوق اور فکری ہم آہنگی کا اطلاق

شاہ صاحب کی اس پوری بحث کا نچوڑ یہ ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی بھی بڑا معاہدہ، چاہے وہ نکاح ہو یا کوئی اور سماجی ذمہ داری، اس وقت تک ثمر آور نہیں ہو سکتا جب تک وہ فرد کی "طبیعت کے موافق" نہ ہو۔ یہ اصول ثابت کرتا ہے کہ شریعت فرد کے "ذاتی اطمینان" کو غیر معمولی اہمیت دیتی ہے۔ چنانچہ، رشتوں کے احترام کا تقاضا یہ ہرگز نہیں کہ فرد کی اپنی بصیرت اور حقِ انتخاب کو کلی طور پر سلب کر لیا جائے۔ ایک متوازن معاشرہ وہی ہے جہاں خاندانی مشورت اور انفرادی آزادی کے درمیان ایک منصفانہ توازن موجود ہو۔

نکاح میں حقِ انتخاب کی پامالی اور سماجی فتنہ و فساد: شاہ ولی اللہؒ کا زاویہ نگاہ

شاہ صاحبؒ انتخابِ رشتہ کے معاملے میں والدین کو ایک سخت نبوی ﷺ انتباہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں، جو ان کے نزدیک خاندانی نظام کی روح ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

> "جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص شادی کا پیغام لائے جس کی دینداری اور عادت سے تم واقف ہو تو اس کے ساتھ شادی کر دو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پیدا ہو گا۔"[7]

معیارِ انتخاب: ذاتی ترجیحات بمقابلہ اخلاقی اقدار

شاہ ولی اللہؒ نے یہاں "دینداری اور عادت" (اخلاق) کو انتخابِ رشتہ کا واحد مستند معیار قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک جب والدین ان بنیادی اوصاف کو نظر انداز کر کے محض برادری، دولت یا اپنی ذاتی انا کی خاطر کسی موزوں پیغام کو رد کرتے ہیں، تو وہ دراصل ایک فطری عمل میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ یہ نکتہ ثابت کرتا ہے کہ والدین کا اختیار لامحدود نہیں بلکہ شرعی اور اخلاقی معیارات کے تابع ہے اور اولاد کی پسند (اگر وہ اخلاق پر مبنی ہو) کو رد کرنا علمی و شرعی طور پر غلط ہے۔

فتنہ و فساد کی عمرانی تشریح

شاہ صاحب کے ہاں "فتنہ اور بڑا فساد" کا تصور محض اخروی سزا نہیں، بلکہ ایک فوری تمدنی خطرہ ہے۔ شاہ صاحب کے فلسفے کے مطابق، جب معاشرہ فرد کے حقِ انتخاب کو کچلتا ہے اور اسے غیر موافق رشتوں میں باندھتا ہے، تو اس کے نتیجے میں معاشرتی بے راہ روی، نفسیاتی بیماریاں اور خاندانی ٹوٹ پھوٹ جنم لیتی ہے۔ یہی وہ فساد ہے جو انسانی تمدن کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔

والدین کا کردار

اس مقام پر شاہ صاحبؒ کی فکر یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ کیا والدین کی حیثیت ایک "سہولت کار" (Facilitator) کی ہے یا ایک ایسے "آمر" کی جو اولاد کے جذبات کو اپنے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔ شاہ صاحب کے نظامِ فکر میں والدین کا اصل امتحان یہ ہے

کہ وہ اولاد کے جائز میلانات کو شرعی دائرے میں جگہ دیں، کیونکہ زبردستی مسلط کیے گئے فیصلے رشتوں کی بنیادیں کھوکھلی کر دیتے ہیں اور خاندانی سکون کو مستقل طور پر غارت کر دیتے ہیں۔

امام ابنِ تیمیہؒ کا استدلال

"وَأَيْضًا فَإِنَّ الْأَبَ لَيْسَ لَهُ أَنْ يَتَصَرَّفَ فِي مَالِهَا إِذَا كَانَتْ رَشِيدَةً إِلَّا بِإِذْنِهَا، وَبُضْعُهَا أَعْظَمُ مِنْ مَالِهَا، فَكَيْفَ يَجُوزُ أَنْ يَتَصَرَّفَ فِي بُضْعِهَا مَعَ كَرَاهَتِهَا وَرُشْدِهَا؟"[8]

"مزید یہ کہ جب بیٹی سمجھدار (رشیدہ) ہو تو باپ کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں کسی قسم کا تصرف کرے۔ جبکہ اس کا وجود اس کے مال سے کہیں زیادہ عظیم اور قیمتی ہے۔ پس یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ باپ اس کے وجود کا فیصلہ اس کی کراہت اور دانائی کے باوجود زبردستی کرے؟"

وجود کی مالیاتی حقوق پر برتری

امام ابنِ تیمیہؒ کا یہ استدلال "بضعها اعظم من مالها" دراصل اس نظرے کی بنیاد ہے کہ انسانی جان کی حرمت اور اس کے شخصی حقوق، مالی حقوق پر مقدم ہیں۔ جب شریعت ایک ادنیٰ چیز (مال) میں لڑکی کو خود مختاری دیتی ہے، تو ایک عظیم تر معاملے (نکاح و وجود) میں اسے مجبور کرنا عقل اور انصاف کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔

ولایت اور تملیک کا فرق

امام ابنِ تیمیہؒ کا یہ استدلال واضح کرتا ہے کہ والدین کی حیثیت "مالک" کی نہیں بلکہ "امین" اور "سرپرست" کی ہے۔ اگر والدین یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا فیصلہ حتمی ہے اور اولاد کا اختلاف کرنا بے ادبی ہے، تو یہ شرعی طور پر درست نہیں۔ شریعت جب اولاد کو اپنے مال کے استعمال میں خود مختاری دیتی ہے، تو نکاح جیسے دائمی اور جذباتی تعلق میں یہ خود مختاری بدرجہ اولیٰ حاصل ہونی چاہیے۔

والدین کی عصمت کا مغالطہ اور انسانی غلطی

امام صاحبؒ کا یہ نکتہ اس عمومی معاشرتی تصور کا علمی محاکمہ کرتا ہے کہ والدین کا فیصلہ ہمیشہ خطا سے پاک ہوتا ہے۔ والدین کی نیت یقیناً خیر خواہی پر مبنی ہوتی ہے۔ تاہم، نیت کا اچھا ہونا فیصلے کے صحیح ہونے کی ضمانت نہیں ہے۔ امام صاحب کا بیٹی کے "رُشد" پر زور دینا یہ ثابت کرتا ہے کہ اولاد کی عقل اور انتخاب کا احترام واجب ہے۔ عصری مشاہدات گواہ ہیں کہ والدین کے جبراً کیے گئے فیصلے اکثر طلاق یا دائمی ذہنی اذیت پر ختم ہوتے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ والدین سے بھی انتخاب میں غلطی ممکن ہے۔

تقدیس اور نفسیات کا توازن

امام صاحبؒ کے الفاظ سے یہ نکتہ اخذ ہوتا ہے کہ معاشرے میں والدین کی "تقدیس" کو نفسیاتی جبر کا ذریعہ نہیں بننا چاہیے۔ تقدیس کا تقاضا ادب و احترام ہے، نہ کہ اپنی فطری اور قلبی رغبت کو کچل دینا۔ تقدیس کا تعلق والدین کے حسنِ سلوک سے ہے، جبکہ نکاح کا تعلق فرد کی نفسیاتی اور قلبی موافقت سے ہے۔ اگر نکاح کی بنیاد میں ہی "کراہت" موجود ہو، تو تقدیس کے نام پر نبھایا جانے والا رشتہ محض ایک معاشرتی بوجھ بن جاتا ہے جو اکثر ناکامی سے دوچار ہوتا ہے۔

تمدنی فساد اور سماجی اثرات

امام ابنِ تیمیہؒ کے استدلال کی روشنی میں فرد کو مجبور کرنا تمدنی عدل کے خلاف ہے۔ جب اولاد کو ان کی مرضی کے خلاف

کسی بندھن میں جکڑا جاتا ہے، تو وہ خاندانی اکائی مستحکم نہیں رہتی۔ طلاقوں کی بڑھتی ہوئی شرح اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ والدین کو "حکم صادر کرنے والے" کی بجائے "مخلص مشیر" کا کردار ادا کرنا چاہیے، تاکہ معاشرے میں استحکام پیدا ہو۔

اطاعتِ والدین کی حدود اور شخصی خود مختاری

والدین کی اطاعت اور اولاد کی شخصی آزادی کے درمیان توازن کو واضح کرتے ہوئے شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ نے "مجموع الفتاویٰ" میں اس اہم نکتے کی وضاحت فرمائی ہے کہ تربیت اور خانگی معاملات میں جبر کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"لَيْسَ لِأَحَدِ الْأَبَوَيْنِ أَنْ يُلْزِمَ الْوَلَدَ بِنِكَاحِ مَنْ لَا يُرِيدُ، وَأَنَّهُ إذَا امْتَنَعَ لَا يَكُونُ عَاقًّا، وَإِذَا لَمْ يَكُنْ لِأَحَدٍ أَنْ يُلْزِمَهُ بِأَكْلِ مَا يَنْفِرُ عَنْهُ مَعَ قُدْرَتِهِ عَلَى أَكْلِ مَا تَشْتَهِيهِ نَفْسُهُ كَانَ النِّكَاحُ كَذَلِكَ وَأَوْلَى فَإِنَّ أَكْلَ الْمَكْرُوهِ مَرَارَةُ سَاعَةٍ، وَعِشْرَةُ الْمَكْرُوهِ مِنَ الزَّوْجَيْنِ عَلَى طُولٍ يُؤْذِي صَاحِبَهُ كَذَلِكَ، وَلَا يُمْكِنُ فِرَاقُهُ."[9]

والدین میں سے کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اولاد کو ایسے نکاح پر مجبور کرے جسے وہ (اولاد) پسند نہ کرتی ہو۔ اور اگر اولاد (ایسے نکاح سے) انکار کر دے تو وہ نافرمان (عاق) نہیں کہلائے گی۔ جس طرح کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اولاد کو ایسا کھانا کھانے پر مجبور کرے جس سے اس کی طبیعت بیزار ہو، جبکہ وہ ایسی چیز کھانے کی قدرت رکھتا ہو جس کی اسے خواہش ہے، تو نکاح کا معاملہ بھی اسی طرح ہے، بلکہ یہ (نکاح) تو اس سے بھی بڑھ کر (اہم) ہے۔ کیونکہ ناپسندیدہ کھانا تو محض ایک لمحے کی تلخی ہے، جبکہ ناپسندیدہ جیون ساتھی کے ساتھ زندگی گزارنا ایک طویل اذیت ہے جو انسان کو مسلسل تکلیف دیتی ہے اور اس سے چھٹکارا بھی (آسانی سے) ممکن نہیں ہوتا۔

حقِ انکار اور نافرمانی کی نفی

ہمارے سماج میں یہ تاثر عام ہے کہ والدین کی ہر بات نہ ماننا "عقوق" (نافرمانی) ہے۔ امام صاحبؒ نے اس کی تردید کرتے ہوئے یہ مسئلہ واضح کیا ہے کہ جہاں انسانی فطرت اور قلبی رغبت آڑے آجائے، وہاں والدین کے حکم سے انحراف کرنا شرعی نافرمانی کے زمرے میں نہیں آتا۔

جبری نکاح کی شرعی حیثیت

امام صاحبؒ نے والدین کے "اختیارِ جبر" کو مکمل طور پر مسترد کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک نکاح کا مقصد دو انسانوں کا باہمی سکون ہے اور جہاں ایک فریق کی مرضی شامل نہ ہو، وہاں والدین کو زبردستی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

غذا اور نکاح کا تقابلی استدلال

امام صاحبؒ نے ایک بہت ہی دلچسپ عقلی دلیل دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کھانا ایک عارضی ضرورت ہے، اگر اس میں جبر جائز نہیں تو نکاح جو کہ ایک دائمی رشتہ ہے، اس میں جبر کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ یہ نکتہ ثابت کرتا ہے کہ انسانی نفسیات اور پسند و ناپسند کا احترام شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔

دائمی اذیت بمقابلہ وقتی تکلیف

امام صاحبؒ کے اسلوبِ استدلال میں یہ الفاظ "مرارة ساعة" (وقت تلخی) اور "عشرة المكروه" (ناپسندیدہ رفاقت) ایک گہرے نفسیاتی مسئلے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ شریعت کسی ایسے بندھن کو پسند نہیں کرتی جو

انسان کے لیے "دائمی ذہنی صدمہ" بن جائے، کیونکہ نکاح سے فرار (یعنی طلاق) معاشرتی طور پر ایک مشکل عمل ہے۔

فرد کی لیگل اینٹٹی (Legal Entity) کا اثبات

امام صاحبؒ کے قول سے یہ نکتہ اخذ ہوتا ہے کہ اسلام میں بالغ اولاد والدین کی محض "ملکیت" نہیں بلکہ ایک خود مختار وجود ہے۔ والدین کی ولایت کا مقصد رہنمائی ہے، نہ کہ شخصی آزادی کو سلب کرنا۔ جہاں مصلحتِ اولاد اور خواہشِ والدین میں ٹکراؤ آ جائے، وہاں اولاد کی مصلحت اور رضا کو فوقیت حاصل ہو گی۔

نفسیاتی تناظر

امام ابنِ تیمیہؒ کے ان تمدنی و فقہی مشاہدات کی تائید ہمیں جدید نفسیاتی نظریات میں بھی ملتی ہے، بالخصوص ایلس ملر (Alice Miller) کی تحقیقات اس موضوع پر نئی روشنی ڈالتی ہیں۔ ملر اپنی کتاب 'The Drama of the Gifted Child' میں اس "باطنی انقطاع" (Internal Disconnection) کی نفسیاتی گہرائیوں کو بے نقاب کرتی ہے جو والدین کی ضرورتوں کے تابع رہنے کے نتیجے میں فرد کی ذات میں پیدا ہوتا ہے۔

The True Self vs. False Self

"Accommodation to parental needs often results in an 'as-if' personality, where the individual projects what is expected of them but cannot express their true emotions. This profound disconnection leads to feelings of emptiness."[10]

"والدین کی ضروریات کے مطابق خود کو ڈھالنے کا نتیجہ اکثر ایک 'جیسی ہونی چاہیے' (as-if) شخصیت کی صورت میں نکلتا ہے، جہاں فرد وہی کچھ ظاہر کرتا ہے جس کی اس سے توقع کی جا رہی ہو، لیکن وہ اپنے حقیقی جذبات کا اظہار نہیں کر پاتا۔ یہ گہرا باطنی انقطاع (disconnection) انسان کے اندر خالی پن کے احساسات کو جنم دیتا ہے۔"

نفاقِ نفسی اور مصنوعی شخصیت کا قیام (Formation of 'As-if 'personality)

ایلس ملر اس تناظر میں جس "As-if Personality" کا ذکر کر رہی ہیں، وہ تمدنی لحاظ سے ایک سنگین مسئلہ ہے۔ جب والدین اپنی مرضی اولاد پر مسلط کرتے ہیں،، تو وہ والدین کی محبت کھو دینے کے ڈر سے ایک "نقاب" اوڑھ لیتی ہے۔ وہ وہی بن جاتی ہے جو اس کے والدین دیکھنا چاہتے ہیں (مثلاً ایک مخصوص ڈگری یا پیشہ)۔ اس کا اپنا "آپ" کہیں دب جاتا ہے، جسے ایلس ملر "حقیقی ذات کا قتل" قرار دیتی ہے۔

- **نفسیاتی پہلو:** اولاد اپنی حقیقی خواہشات کو کچل کر ایک ایسا ملمع (Facade) اوڑھ لیتی ہے جو والدین کے لیے قابلِ قبول ہو۔ یہ عمل شخصیت کے فطری ارتقاء کو روک دیتا ہے۔
- **اسلامی تناظر:** یہ صورتحال دراصل "نفاق" کی ایک نفسیاتی قسم ہے، جہاں انسان کا ظاہر اس کے باطن سے جدا ہو جاتا ہے۔ اسلام صدق (سچائی) کا داعی ہے اور جبر کے نتیجے میں پیدا ہونے والا یہ "مصنوعی پن" فرد کو اس کے اپنے نفس کے سامنے جھوٹا بنا دیتا ہے۔ اسلام انسان کو اس کی "فطرت" پر قائم دیکھنا چاہتا ہے۔ شریعت میں جبر (Coercion) کو اس لیے ناپسند کیا گیا ہے کیونکہ یہ انسان کے اندر "نفاق" پیدا کرتا ہے۔ جب اولاد والدین کے دباؤ میں آ کر اپنی ترجیحات دباتی ہے، تو وہ منافقت کی ایک ایسی صورت ہے جہاں ظاہر باطن سے مختلف ہو جاتا ہے۔

جذباتی اظہار پر پابندی اور داخلی انقطاع (Profound Disconnection)

استدلال کا دوسرا اہم نکتہ "Disconnection" ہے۔ جب اولاد کو اپنے سچے جذبات (True Emotions) کے اظہار کی اجازت نہیں ہوتی، تو ان کا اپنے ہی احساسات سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔

- **نفسیاتی پہلو:** جب انسان اپنے دکھ، غصے یا ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کر پاتا، تو وہ "جذباتی مفلوجی" کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کی توقعات کا قیدی بن کر اپنی ذات سے بیگانہ (Alienated) ہو جاتا ہے۔
- **اسلامی تناظر:** امام ابنِ تیمیہؒ کے فلسفۂ ارادہ کے مطابق، انسانی فعل کی قدر اس کی "رغبتِ قلبی" میں ہے۔ جب رغبت اور عمل کے درمیان یہ انقطاع پیدا ہو جائے، تو فرد کی زندگی سے برکت اور سکون ختم ہو جاتا ہے۔

باطنی خلا اور وجودی بے معنویت (Existential Emptiness)

ایلس ملر کہتی ہیں کہ اس جبر اور مصنوعی پن کا آخری نتیجہ "Emptiness" (خالی پن) ہے۔

- **نفسیاتی پہلو:** ایک ایسی زندگی جو دوسروں کے فیصلوں کے گرد گھومتی ہو، وہ انسان کو اندر سے خالی کر دیتی ہے۔ چاہے وہ شخص دنیاوی طور پر کتنا ہی کامیاب کیوں نہ نظر آئے، اسے اپنی زندگی بے معنی محسوس ہوتی ہے۔
- **اسلامی تناظر:** اسلام "نفسِ مطمئنہ" کا مطالبہ کرتا ہے۔ والدین کا جبر اولاد کو "نفسِ مطمئنہ" کی بجائے "نفسِ مضطرب" کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ یہ خالی پن دراصل اس انسانی تکریم (Human Dignity) کی پامالی ہے جو اللہ نے ہر فرد کو بطورِ امانت عطا کی ہے۔

مصلحتِ ولایت کا فقدان (Failure of Tutelary Guardianship)

تمدنی نقطہ نظر سے یہ بیانیہ اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ جب والدین اولاد کی "جذباتی توثیق" (Validation) کی بجائے ان پر اپنی مرضی مسلط کرتے ہیں، تو وہ "ولایت" کے اصل مقصد سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ ولایت (Guardianship) کا مقصد تحفظ ہے، تسلط نہیں۔ اگر والدین کا فیصلہ اولاد کو "مصنوعی شخصیت" بننے پر مجبور کر دے، تو یہ ولایت ضرر (Harm) بن جاتی ہے، اور فقہی قاعدہ ہے کہ "الضرر یزال" (نقصان کو زائل کیا جائے گا)۔ ایلس ملر کی یہ تحقیق امام ابنِ تیمیہؒ کے اس موقف کو جدید سائنسی بنیاد فراہم کرتی ہے کہ "کسی کو ایسی چیز پر مجبور کرنا جس کی اس میں رغبت نہ ہو، اسے ایک لایعنی اور مصنوعی زندگی میں دھکیلنا ہے"۔ یہ جبر نہ صرف فرد کی نفسیات کو تباہ کرتا ہے بلکہ معاشرے میں ایسے "خالی" افراد پیدا کرتا ہے جن کا عمل ان کی نیت کے تابع نہیں ہوتا۔

جدید نفسیاتی تناظر: ایرک ایرکسن اور تمدنی نشوونما

والدین کے جبر اور شخصیت کے بگاڑ کے اس نفسیاتی مطالعے کو مزید وسعت دینے کے لیے مشہورِ عالم ماہرِ نفسیات ایرک ایرکسن (Erik Erikson) کی تحقیقات کا جائزہ لینا ناگزیر ہے۔ ایرکسن اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'Childhood and Society' میں ان سماجی اور نفسیاتی مراحل کی نشاندہی کرتا ہے جہاں والدین کا غیر ضروری تسلط اولاد کی فطری نمو کو مفلوج کر دیتا ہے۔

AUTONOMY VS. SHAME AND DOUBT

" For if denied the gradual and well-guided experience of the autonomy of free choice (or if, indeed, weakened by an initial loss of trust) the child will turn against himself all his urge to discriminate and to

manipulate. He will overmanipulate himself, he will develop a precocious conscience. Instead of taking possession of things in order to test them by purposeful repetition, he will become obsessed by his own repetitiveness. Such hollow victory is the infantile model for a compulsion neurosis. It is also the infantile source for later attempts in adult life to govern by the letter, rather than by the spirit."[11]

"اگر بچے کو آزادانہ انتخاب کی خود مختاری (Autonomy of free choice) کے تدریجی اور بہتر رہنمائی والے تجربے سے محروم کر دیا جائے، تو بچہ اپنی تمام تر تمیز کرنے اور حالات کو بدلنے کی صلاحیتوں کو خود اپنے ہی خلاف استعمال کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے ساتھ حد سے زیادہ سختی کرے گا اور وقت سے پہلے ایک ضمیر (Precocious conscience) پیدا کر لے گا (جو اسے ہر وقت ملامت کرے گا)۔ چیزوں کو بامقصد طریقے سے آزمانے کی بجائے، وہ اپنی ہی تکرار (Repetitiveness) کا شکار ہو جائے گا۔ یہ کھوکھلی فتح دراصل بچپن کا وہ نمونہ ہے جو آگے چل کر "مجبوری کے اعصابی مرض" (Compulsion Neurosis) کی بنیاد بنتا ہے۔ یہی وہ بچپن کا ذریعہ ہے جو بلوغت کی زندگی میں انسان کو اس بات پر اکساتا ہے کہ وہ زندگی کو اس کی روح (Spirit) کی بجائے محض لفظی قوانین (Letter) کے ذریعے چلانے کی کوشش کرے۔"

آزادانہ انتخاب کی محرومی اور خود دشمنی (Self-Hostility)

ایرکسن واضح کر رہا ہے کہ جب والدین اولاد کو ان کی اپنی مرضی اور پسند (Free Choice) سے محروم کرتے ہیں، تو اولاد کے اندر کا غصہ باہر نکلنے کی بجائے ان کی اپنی ذات کی طرف مڑ جاتا ہے۔ تمدنی لحاظ سے یہ ایک ایسی نسل پیدا کرتا ہے جو خود اعتمادی سے خالی ہوتی ہے اور ہمیشہ خود کو قصوروار سمجھتی ہے۔

وقت سے پہلے بیدار ہونے والا ضمیر (Precocious Conscience)

جبر کے نتیجے میں اولاد کے اندر ایک ایسا سخت گیر ضمیر پیدا ہو جاتا ہے جو اسے ہر چھوٹے کام پر ملامت کرتا ہے۔ یہ وہی نکتہ ہے جو امام ابنِ تیمیہؒ کے "دائمی صدمے" سے ملتا ہے، جہاں انسان مسلسل ذہنی دباؤ میں رہتا ہے کیونکہ وہ اپنی فطرت کے خلاف دوسروں (والدین) کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔

تمدنی جمود اور لفظی پابندی (Letter vs. Spirit)

ایرکسن کہتا ہے کہ جس اولاد پر جبر کیا گیا ہو، وہ بڑے ہو کر سماجی و مذہبی زندگی کو اس کی "روح" (Spirit) کے ساتھ نہیں جی پاتے، بلکہ وہ صرف لکیر کے فقیر (Letter of the law) بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ صرف حکم ماننے والی مشینیں (Robots) بن جاتے ہیں، جن کے اندر تخلیقی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ ایرک ایرکسن کی یہ تحقیق واضح کرتی ہے کہ والدین کا جبر اولاد کو ایک نفسیاتی مریض (Compulsion Neurosis) بنا دیتا ہے جو سماج میں فعال کردار ادا کرنے کی بجائے محض ڈر اور خوف کے سائے میں زندگی گزارتا ہے۔

عمرانی و تمدنی تناظر

آمریت پسندانہ خاندانی طرزِ عمل کے اثرات محض نفسیاتی نہیں رہتے بلکہ فرد کی سماجی اور فکری تشکیل کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ مشہور ماہرِ عمرانیات ڈائنا بومرنڈ (Diana Baumrind) نے اس طرزِ عمل کو "آمریت پسندانہ" (Authoritarian) قرار

دیتے ہوئے اس کے منفی پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے۔

> "Parents using the authoritarian (rigid rule) approach are low in support and high in demandingness. These parents expect and demand obedience because they are 'in charge' and they do not provide any explanations for their orders. Children reared in environments using the authoritarian approach are more likely to be obedient and proficient, but score lower in happiness, social competence, and self-esteem."[12]

آمریت پسندانہ (سخت گیر) طرزِ عمل رکھنے والے والدین ہمدردی میں کم لیکن مطالبات میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ یہ والدین صرف اس بنیاد پر مکمل اطاعت کی توقع اور مطالبہ کرتے ہیں کہ "حکم ان کا چلے گا" اور وہ اپنے احکام کی کوئی علمی یا منطقی وضاحت پیش نہیں کرتے ایسے ماحول میں پرورش پانے والے بچے اگرچہ بظاہر فرمانبردار اور ماہر لگتے ہیں لیکن وہ خوشی، سماجی مہارتوں اور خود اعتمادی کے پیمانے پر بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔

بومرنڈ کی اس تحقیق سے چند تمدنی و فکری مسائل سامنے آتے ہیں جنہیں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنا ضروری ہے۔

بغیر وضاحت کے حکم اور فکری جمود

بومرنڈ کے مطابق جب والدین اپنی بات کی کوئی وجہ (Explanation) نہیں بتاتے، تو اولاد کی سوال کرنے اور سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ اسلامی تناظر میں دیکھیں تو قرآن تدبر اور تفکر کی دعوت دیتا ہے۔ والدین کا یہ رویہ اولاد کو غیر تنقیدی اطاعت کا عادی بنا دیتا ہے، جو تمدنی طور پر ایک ایسی نسل پیدا کرتا ہے جو دلیل کی بجائے صرف طاقت کے سامنے سر جھکانا جانتی ہے۔

مصنوعی فرمانبرداری کا المیہ

بومرنڈ کا نظریہ واضح کرتا ہے کہ جبر کے تحت پرورش پانے والے بچے بظاہر "مطیع" (Obedient) تو نظر آتے ہیں، مگر داخلی طور پر خوشی اور خود اعتمادی سے محروم ہوتے ہیں۔ اسلام میں "نیت" اور "قلبی اطمینان" کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اگر اولاد والدین کا حکم صرف خوف یا دباؤ کی وجہ سے مان رہی ہے، تو یہ ان کے درمیان اس حقیقی محبت اور احترام کے رشتے کو کمزور کر دیتا ہے جس کا حکم دین نے دیا ہے۔

تمدنی مہارتوں کی کمی اور سماجی تنہائی

جبر زدہ اولاد میں سماجی مہارتوں (Social Competence) کی کمی رہ جاتی ہے۔ اسلام ایک تمدنی دین ہے جو فرد کو معاشرے کا فعال اور خود اعتماد حصہ بنانا چاہتا ہے۔ والدین کا حد سے زیادہ کنٹرول اولاد کو فیصلے کرنے کی قوت سے محروم کر دیتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ عملی زندگی کے چیلنجز کا سامنا کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ یہ مطالعہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ والدین کا جابرانہ رویہ اولاد کی شخصیت کو اس توازن سے محروم کر دیتا ہے جو اسلام کے تمدنی انصاف اور جدید نفسیات دونوں کا تقاضا ہے۔ والدین کی ولایت کا مقصد اولاد کی شخصیت کو کچلنا نہیں بلکہ اسے ایک بااعتماد اور باشعور انسان بنانا ہے۔

جدید اسلامی فکر: طارق رمضان اور خاندانی تربیت

ڈائنا بومرنڈ کے نفسیاتی مشاہدات کی تائید جدید مفکر طارق رمضان کی اسلامی فکر سے بھی ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک والدین کی اصل اتھارٹی اولاد پر اپنی مرضی مسلط کرنا نہیں بلکہ ان کی شخصیت کی رہنمائی کرنا ہے۔ ان کے مطابق جابرانہ رویہ اولاد کے تنقیدی شعور کو ختم کر کے انہیں محض "تابع دار سائے" بنا دیتا ہے، جو تمدنی ارتقاء کے لیے نقصان دہ ہے۔

"In the area of education and the family, authority is often understood as the right to impose, where as its primary function is to accompany. Respect for parents and elders is a fundamental principle, but it should not lead to the negation of the child's personality or the suppression of their critical mind. True Islamic education aims to create autonomous and responsible individuals, not submissive shadows."[13]

تعلیم اور خاندان کے دائرے میں، "ولایت" (Authority) کو اکثر مرضی مسلط کرنے کا حق سمجھ لیا جاتا ہے، جبکہ اس کا بنیادی کام (اولاد کی شخصیت کے ساتھ) چلنا اور رہنمائی کرنا ہے۔ والدین اور بڑوں کا احترام ایک بنیادی اصول ہے، لیکن یہ بچے کی شخصیت کی نفی یا اس کے تنقیدی شعور کو دبانے کا باعث نہیں بننا چاہیے۔ حقیقی اسلامی تعلیم کا مقصد ایسے خود مختار اور ذمہ دار افراد پیدا کرنا ہے جو اپنی پہچان رکھتے ہوں، نہ کہ وہ محض (والدین کا) ایک تابع دار سایہ بن کر رہ جائیں۔

طارق رمضان کے ان فکری استدلالات کی روشنی میں عصرِ حاضر کے چند اہم تمدنی و فکری مسائل کی تشخیص درج ذیل نکات کے تحت کی جا سکتی ہے:

ولایت کا غلط تصور (Misconception of Authority)

طارق رمضان کے مطابق والدین کا حقِ ولایت اولاد پر مرضی مسلط کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ ان کی نشوونما میں ان کا ساتھ دینے (To accompany) کا نام ہے۔ والدین کا جابرانہ رویہ اس ولایت کا غلط استعمال ہے جو تمدنی بگاڑ کی بنیاد بنتا ہے۔

شخصیت کی نفی (Negation of Personality)

وہ واضح کرتے ہیں کہ "احترامِ والدین" کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اولاد کی اپنی شخصیت کو ختم کر دیا جائے۔ اسلام میں والدین کی اطاعت واجب ہے، لیکن ایسی اطاعت جو فرد کو "بے جان سایہ" (Submissive shadow) بنا دے، وہ اسلامی تمدن کے لیے نقصان دہ ہے کیونکہ ایسا فرد معاشرے میں کوئی فعال کردار ادا نہیں کر پاتا۔

تنقیدی شعور کی اہمیت (Suppression of Critical Mind)

جب والدین اولاد کی سوچ اور سوال پر پابندی لگاتے ہیں، تو وہ ان کا تنقیدی شعور (Critical Mind) دبا دیتے ہیں۔ اسلامی تناظر میں دیکھیں تو یہ شعور ہی انسان کو "خلیفہ" کی ذمہ داریاں نبھانے کے قابل بناتا ہے۔ اس کے بغیر تمدن میں اجتہادی اور تعمیری سوچ ختم ہو جاتی ہے۔

فکرِ مودودی میں جبر کی نفی اور تمدنی آزادی کا تصور

سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی تصنیف "تفہیمات" میں قرآنی اصول "لا اکراہ فی الدین" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اسلامی نظامِ زندگی کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ اسلامی نظامِ زندگی میں سرے سے جابرانہ قوت (Coercive Power) کے استعمال کا کوئی مقام ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ دینِ اسلام کو قبول کرنے کے معاملے میں جبر کا کوئی کام نہیں، جو قبول کرنا چاہے وہ اپنی آزاد مرضی سے قبول کرے اور جو قبول نہ کرنا چاہے اسے کوئی زبردستی ایمان لانے پر مجبور نہ کرے گا۔"[14]

فکرِ مودودی کا یہ جوہر اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ جب اسلام جیسا عالمگیر دین اپنے قبول کیے جانے کے معاملے میں

انسانی آزاد مرضی کو مقدم رکھتا ہے، تو تمدن کی پہلی اکائی یعنی خاندان میں بھی کسی نظریے یا طرزِ عمل کو طاقت کے زور پر مسلط کرنا اسلامی روح کے منافی قرار پاتا ہے۔ والدین کا سخت گیر رویہ اولاد کی مرضی کو کچل دیتا ہے، جو دراصل اس قرآنی حکمتِ عملی کی صریح نفی ہے جس کا ذکر مولانا نے یہاں صراحت کے ساتھ کیا ہے۔

نظم وضبط اور فکری خود مختاری

فکرِ مودودی کا یہ جوہر اس حقیقت کو مبرہن کرتا ہے کہ "جبر" کا استعمال نظم وضبط قائم کرنے کے لیے تو ناگزیر ہو سکتا ہے، لیکن انسانی عقیدے، فکر اور ضمیر کی تبدیلی میں سختی کبھی کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ تمدنی بگاڑ کے تناظر میں اس کا اطلاق اس طرح ہوتا ہے کہ والدین ڈسپلن کی حد تک تو سختی کر سکتے ہیں، لیکن اسے اولاد کی فکری آزادی اور شخصیت کے نمو میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ اگر تربیت کی بنیاد محض "جابرانہ قوت" پر ہو گی تو یہ معاشرے میں منافقت اور بزدلی جیسے مہلک تمدنی امراض پیدا کرے گی۔

فکرِ مودودی میں تمدنی بگاڑ اور باطنی فساد کے اسباب

انسانی معاشرت اور تمدنی ارتقاء کی اساس محض مادی ضرورتوں پر نہیں بلکہ ان اخلاقی اور فکری بنیادوں پر قائم ہوتی ہے جو فرد کی شخصیت کو متوازن بناتی ہیں۔ جب ان بنیادوں میں عدم توازن یا بے اعتدالی پیدا ہو جائے، تو پورا تمدنی ڈھانچہ بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی تصنیف "تفہیمات" میں تمدن کے اسی باطنی فساد اور اس کے پسِ پردہ محرکات کی نشاندہی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "ایک الہام شیطانی، جو اشخاص اور جماعتوں کو خود غرضی، نفس پرستی، عیش پسندی، لذت طلبی، تنگ نظرانہ منفعت خواہی، بغض، حسد، ظلم، شقاوت اور بے اعتدالی کی طرف راغب کرتا ہے۔ لطافت کے معیار، معقولات کے ادراک اور کمال کے تصورات کو غلط راستوں پر ڈال دیتا ہے۔ تمدن کی صورتِ نوعی میں ظاہری چمک دمک مگر باطنی فساد اور بدانجامی پیدا کرتا ہے۔"[15]

اگر اس تصور کو خاندانی تربیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس کے کئی اہم سماجی اور نفسیاتی مضمرات سامنے آتے ہیں۔

تربیت میں بے اعتدالی اور ظلم

مولانا نے "ظلم اور بے اعتدالی" کو تمدنی بگاڑ کا سبب قرار دیا ہے۔ والدین جب تربیت کے نام پر اولاد پر حد سے زیادہ سختی کرتے ہیں، تو یہ وہی "بے اعتدالی" ہے جو تمدن کی بنیادوں کو ہلا دیتی ہے۔ والدین جب اولاد کی تربیت میں ان کی فطری ضرورتوں، انفرادی رجحانات اور نفسیاتی تقاضوں کو نظر انداز کر کے غیر فطری دباؤ کا راستہ اختیار کرتے ہیں، تو یہ دراصل اس تمدنی فساد کا آغاز ہوتا ہے جس کا ذکر ابوالاعلیٰ مودودیؒ کرتے ہیں۔

باطنی فساد اور ظاہری چمک دمک

سخت گیر والدین کی وجہ سے اولاد بظاہر تو باادب اور منظم (ظاہری چمک دمک) نظر آتی ہے، لیکن ان کی شخصیت کے اندر "باطنی فساد" جنم لیتا ہے۔ یہ منافقت اور شخصیت کا دوغلا پن پورے تمدن کے لیے تباہ کن ہے۔ وہ تمدن جو بظاہر "بہت شاندار" یعنی نظم وضبط کا حامل نظر آئے، اگر اس کے پیچھے اولاد کے ذہنوں پر غیر ضروری بوجھ ہو، تو وہ شخصیت کے باطنی حسن کو ختم کر دیتا ہے۔ والدین کی حد سے بڑھی ہوئی سختی بظاہر ایک منظم خاندان تو دکھا سکتی ہے، مگر وہ اولاد کی روح کو اخلاقی بگاڑ کی طرف دھکیل دیتی ہے۔

ادراک اور کمال کے تصورات کا بگاڑ

جب گھر کے ماحول میں جبر شامل ہو جائے، تو انسان کے "معقولات کے ادراک اور کمال کے تصورات" غلط راستوں پر پڑ جاتے ہیں۔ یعنی اولاد صحیح اور غلط کی تمیز دلیل کی بجائے صرف ڈر کی بنیاد پر کرنے لگتی ہے۔ تمدن کی بقا اخلاق پر ہے۔ جب والدین کا رویہ اولاد میں خوف پیدا کر دے، تو اولاد سچائی کی بجائے جھوٹ اور مصلحت کا سہارا لینے لگتی ہے۔ یہ اخلاقی بگاڑ جب خاندان سے نکل کر معاشرے میں پھیلتا ہے، تو پورے تمدن کا ڈھانچہ کمزور ہو جاتا ہے۔ فکرِ مودودی کا یہ جوہر اس حقیقت کو مبرہن کرتا ہے کہ تمدن کے استحکام کے لیے ضروری ہے کہ خاندانی اکائی میں ظلم اور تجاوز کی بجائے عدل اور فطری آزادی کو جگہ دی جائے۔ اولاد کی شخصیت کا احترام کرنا دراصل تمدن کو باطنی فساد سے بچانا ہے۔

حاصلِ بحث

تحقیق کے تمام مراحل اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ خاندانی نظام میں والدین کا طرزِ عمل محض ایک نجی معاملہ نہیں بلکہ تمدنی عروج و زوال کا پیش خیمہ ہے۔ امام غزالی کے نظریہ تربیت کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بچہ والدین کے پاس ایک قیمتی امانت ہے، اور جب اس امانت کی پرورش جبر اور سختی سے کی جاتی ہے تو اس کے قلب کی لطافت ختم ہو جاتی ہے، جس کا براہِ راست اثر معاشرے کے اخلاقی ڈھانچے پر پڑتا ہے۔ ابنِ تیمیہ کے افکار اس نکتے کو مزید تقویت دیتے ہیں کہ تربیت میں عدل کا دامن چھوڑ کر جب محض طاقت کا استعمال کیا جاتا ہے، تو یہ تمدن میں ظلم اور نفاق کی بنیاد بنتا ہے، جو افراد کو تخلیقی جوہر سے محروم کر دیتا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے تمدنی فلسفے اور ارتفاقات کے نظام کے تناظر میں دیکھا جائے تو خاندان کی اصلاح کے بغیر ایک متوازن ریاست کا قیام ممکن نہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک اگر والدین کا رویہ فطری توازن سے ہٹ کر جابرانہ ہو جائے، تو یہ تمدن کی پہلی اکائی میں ہی فساد پیدا کر دیتا ہے، جس سے معاشرے کا نظم و ضبط منتشر ہو جاتا ہے۔ اسی فکری تسلسل میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے افکار یہ حقیقت مبرہن کرتے ہیں کہ جب خاندانی تربیت میں اعتدال کا دامن چھوٹ جائے اور حدودِ فطرت سے تجاوز کیا جائے، تو تمدن "باطنی فساد اور بدانجامی" کا شکار ہو جاتا ہے۔ مولانا کے نزدیک تربیت کا اصل مقصد فرد کو محض اطاعت گزار بنانے کی بجائے اس کے اندر وہ اخلاقی شعور بیدار کرنا ہے جو ایک صالح تمدن کی اساس ہے۔ جدید دور میں ایلس ملر اور ڈائنا بومرنڈ کے نفسیاتی مشاہدات سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جابرانہ طرزِ عمل اولاد کی خود مختاری کو کچل دیتا ہے۔ طارق رمضان کی جدید اسلامی فکر بھی اسی قدیم روایت کی بازگشت معلوم ہوتی ہے کہ تربیت کا مقصد تنقیدی شعور (Critical Mind) کی بیداری ہے، نہ کہ اولاد کو محض تابع دار سائے میں تبدیل کرنا۔

مجموعی طور پر یہ علمی مطالعہ اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ خاندانی سطح پر جابرانہ طرزِ تربیت ایک تمدنی المیے کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو نسلوں کی فکری اور شعوری آزادی سلب کر لیتا ہے۔ جب تک خاندانی نظام میں امام غزالی کی تجویز کردہ شفقت، شاہ ولی اللہ کے توازن اور ابنِ تیمیہ کے عدل کو عملی طور پر رائج نہیں کیا جائے گا، تب تک ایک باشعور اور اصلاح پسند تمدن کی تشکیل ناممکن ہے۔ اسلام جس انسانی وقار اور بصیرت کا تقاضا کرتا ہے، جابرانہ رویے اس کی راہ میں سب سے بڑی فکری رکاوٹ ہیں جو تمدنی ارتقاء کے عمل کو روک دیتے ہیں۔

تجاویز و سفارشات

- جامعات اور دینی مدارس کے نصاب میں "فقہ التربیہ" اور "خاندانی عمرانیات" کو مستقل مضمون کے طور پر شامل کیا

جائے۔ اس سے طلبہ تمدنی ارتقاء میں خاندان کے مشاورتی کردار اور اولاد کے حقوق کو علمی تناظر میں سمجھ سکیں گے۔

- عصرِ حاضر کے محققین کو چاہیے کہ وہ سخت گیر تربیتی رویوں کے تمدنی اثرات کا مطالعہ شاہ ولی اللہ کے نظریۂ ارتفاقات اور امام غزالی کے اصولِ تربیت کی روشنی میں کریں، تاکہ اس اہم مسئلے کا علمی اور عملی حل سامنے آسکے۔
- آئمہ اور خطباء حضرات جمعہ کے خطبات میں سیرتِ نبوی ﷺ کے ان پہلوؤں کو اجاگر کریں جہاں اولاد کی شخصیت کے احترام اور فکری نشوونما کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، تاکہ معاشرے میں آمریت پسندانہ طرزِ تربیت کی بجائے شفقت و عدل کا کلچر عام ہو۔
- علمی مراکز کو چاہیے کہ وہ ایسا مستند لٹریچر اور مختصر کتابچے تیار کریں جو جدید نفسیاتی مسائل اور اسلامی نظامِ تربیت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کریں اور والدین کو سخت گیر رویوں کے تمدنی نقصانات سے آگاہ کر سکیں۔
- اس موضوع پر ہونے والی تحقیقی کاوشوں کو انگریزی اور عربی زبانوں میں منتقل کیا جائے تاکہ عالمی سطح پر اسلامی نظریہ تربیت کی انفرادیت اور انسانی شخصیت کی تکریم کے حوالے سے اسلام کے آفاقی اصولوں کو واضح کیا جاسکے۔

References

1 al-Ghazālī, Abū Ḥāmid. *Iḥyā' 'Ulūm al-Dīn*. Translated by Maulānā Nadīm al-Wājidī (Karachi: Dār al-Ishā'at, n.d), 2:350.

2 al-Bukhārī, Muḥammad ibn Ismā'īl. *al-Adab al-Mufrad*. (Riyadh: Dar Al Salam, 1999), Bāb: Birr al-Ab li-Waladihi, Hadith No. 94.

3 al-Ghazālī, *Iḥyā' 'Ulūm al-Dīn*, 2:351-352.

4 al-Tabrīzī, Walī al-Dīn Muḥammad ibn 'Abd Allāh. *Mishkāt al-Maṣābīḥ*. (Riyadh: Dar Ibn Hazm, 2002), Kitāb: al-Imārah wa al-Qaḍā', Hadith No. 3665.

5 Shāh Walī Allāh al-Dehlawī, *Ḥujjat Allāh al-Bālighah*. Translated by Abū Muḥammad 'Abd al-Ḥaqq Ḥaqqānī (Karachi: Nur Muḥammad Aṣaḥ al-Maṭābi'wa Kārkhānah-e-Tijārat-e-Kutub, n.d.), 2:363.

6 Ibid, 2:361.

7 Ibid.

8 Ibn Taymiyyah, Ahmad bin Abdul Halim. *Majmu' al-Fatawa*. (Al-Madinah al-Munawwarah: Majma' al-Malik Fahd li-Tiba'at al- Mushaf al-Sharif, 1425H - 2004M), 32:23.

9 Ibid, 32:30.

10 Miller, Alice. The Drama of the Gifted Child: The Search for the True Self (New York: Basic Books, 1997), 10.

11 Erikson, Erik H., Childhood and Society (New York: W. W. Norton & Company, 1950), 222.

12 Moraco, Joel A., Wendy Ruiz, Rebecca Laff, Ross Thompson, and Diana Lang, "Diana Baumrind's Parenting Styles," in Family Development Theory (Open Educational Resource, 2026).

13 Ramadan, Tariq, Radical Reform: Islamic Ethics and Liberation (Oxford: Oxford University Press, 2009), 142.

14 Maudūdī, Sayyid Abul A'lā. *Tāfhīmāt* (Delhi: Markazī Maktaba Islāmī, 4: 89-90.

15 Ibid, 4:302.